ضیاالحسن

آخری فریاد

خلیل طوق اُرکا گلاب پر ٹپکتا ''ایک قطرہ آنسو'' جب مجھ تک پہنچا تو میں بہت حیران ہوا، اس لیے نہیں کہ یہ ایک ترک نوجوان کی اردو شاعری تھی، بل کہ اس لیے کہ یہ مکمل شاعری تھی، سرزمین ترکی کی خوش بو میں بسے ہوئے استعاروں میں اردو زبان کے لیے ایک نیا ذائقہ دریافت کرتی ہوئی خالص شاعری۔ ''ایک قطرہ آنسو'' کے شاعر خلیل طوق اُرنے پہلی ملاقات میں بغیر کسی تکلف اور جھجک کے جب مجھے دیباچہ لکھنے کو کہا تو اس وقت تک میں ان کے پہلے شعری مجموعے کا مطالعہ کر چکا تھا جس کی وجہ سے میں مروتاً اقرار کرنے کی زحمت سے بچ گیا، کیوں کہ ''ایک قطرہ آنسو'' کے شاعر کا دیباچہ لکھنا مجھے اپنے لیے اعزاز لگا، سو میں نے اس اعزاز کے حصول کی خاطر فوراً اسی بے تکلفی سے وعدہ کر لیا۔

خلیل طوق اُرکی شاعری دو زبانوں اور دو تہذیبوں کے تخلیقی عناصر کی یک جائی سے ظہور پذیر ہوئی ہے۔ ان کو پڑھتے ہوئے بار بار محسوس ہوتا ہے جیسے لمحۂ تخلیق میں بھی وہ دو زبانوں کی تہذیبی سرزمینوں سے بہ یک وقت نمو پذیری کی قوت حاصل کرتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کی شاعری میں ایک مختلف فضا قائم ہوتی ہے۔ یہ فضا کسی مترجم کی بنائی ہوئی فضا سے اِس لیے مختلف ہے کہ جہاں اس میں ترجمہ نگاری کے عناصر کارفرما ہیں، وہیں ساتھ کے ساتھ قوتِ تخلیق بھی اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ خلیل طوق اُرترک ذہن سے سوچتے ہوئے جب تخلیقی عمل سے گزرتے ہیں تو یہ تخلیقی عمل ترجمہ نگاری سے سوا ہو جاتا ہے اور ایک نئے تخلیقی تجربے کی بازیافت بن جاتا ہے۔

خلیل طوق اُر یقیناً ترکی زبان کے بہترین شاعر ہوں گے، کیوں کہ ان کی اردو شاعری صاف پتا دیتی ہے کہ وہ ازل سے شاعر کا دل و دماغ لے کر آئے ہیں۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں، لیکن ان کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ وہ زندگی کو نظم کے زاویے سے زیادہ تخلیقی انداز میں دیکھنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری ہمیں جس تخلیق کار سے متعارف کراتی ہے وہ خدا پرست، انسان پرست اور اقدار پرست انسان ہے جو اردگرد پھیلی زندگی کے بے ڈھنگے پن پر شدت سے دکھی ہے اور ایمان رکھتا ہے کہ انسان

خدا سے دوری کی وجہ سے اس بدحالی کا شکار ہوا ہے۔ وہ مغربی اور غیر مغربی اقوام کے درمیان تفاوت اور امیر و غریب کے مابین عدم توازن اور اس کی وجوہات سے باخوبی آگاہ ہیں اور سرمایہ داری نظام کی لعنتیں ان پر پوری طرح آشکار ہیں۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو وہ ایک مستند ترقی پسند شاعر نظر آتے ہیں جو ترقی پسندی کے لیے کسی تنظیم یا تحریک کے مرہونِ منت نہیں، بل کہ انسانیت کے زخم انھیں اپنے بدن پر محسوس ہوتے ہیں اور ان کا ایسے ہی درد محسوس کرتے ہیں جیسے یہ زخم خود ان کے جسم پر لگے ہوں۔ خلیل طوق اُر شعر برائے شعر گفتن کے قائل نہیں ہیں، بل کہ وہ شاعری اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ ہے، جس کو بیان کرنے کے لیے انھوں نے کہیں کہیں استعاراتی زبان وضع کی ہے لیکن کہیں کہیں براہِ راست پیرایہ بھی اختیار کیا ہے۔ ایسا شاعر جسے انسانی بے بسی کا احساس شعر گوئی پر پر مجبور کرتا ہے، بعض اوقات استعاراتی زبان سے مطمئن نہیں ہوتا اور اسے براہِ راست بیان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ وہی ضرورت ہے جس نے نثری نظم کی راہ ہموار کی۔ اگر چہ خلیل طوق اُر عروضی شاعری پر قادر ہیں، لیکن انھوں نے بھی اس باطنی تقاضے پر نثری نظم کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔ یہ تو نہیں کہ ان کی عروضی شاعری کم تر درجے کی شاعری ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ تخلیقی وفور کا طاقت ور اظہار ان سے نثری نظم میں ممکن ہوا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ عروضی پابندی ان کے تخلیقی تجربے کی راہ کی رکاوٹ ہے، کیوں کہ غیر عروضی نظموں میں ان کے ہاں وہ روانی ملتی ہے جو ان کے تجربے کی صداقت کی امین ہے۔ انھوں نے ایسی ایسی شان دار نظمیں تخلیق کی ہیں کہ دل یہ ماننے کو تیار نہیں ہوتا کہ وہ غیر اردو تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسا صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کوئی شاعر زبان کے ساتھ ساتھ تہذیب کو بھی اپنے باطنی تجربے کا حصہ بنا چکا ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ خلیل طوق اُر اردو ادب کے توسط سے اردو زبان کی تہذیب کو بھی اپنی ذات کا حصہ بنانے میں کام یاب ہو چکے ہیں کیوں کہ ایسا اعلا تخلیقی تجربہ تہذیب سے کٹ کے دائرۂ امکان سے خارج ہو جاتا ہے۔

مجھے خلیل طوق اُر سے باطنی نسبت ہے۔ ان کے لب و لہجے میں طاقت ور مغربی قوموں کے حکم رانوں کے تلوے چاٹتے تیسری دنیا کے حکم رانوں کے خلاف وہی نفرت اور حقارت ہے جو مجھے اپنے اندر محسوس ہوتی ہے اور شاید ان ممالک کے ہر ذی شعور اور حساس انسان کا لازمی تجربہ ہے۔ ان کی نظم ''مالک کے کتے'' میں جہاں زر پرست معاشرے میں سرمایہ دار اور جاگیر دار کے زر خرید گماشتوں کے لیے کتے کا استعارہ وضع ہوا ہے وہاں عالمی سیاست کے تناظر میں مقامی حکم ران بھی اس کی ذیل میں آتے ہیں۔

خلیل طوق اُر کی نظموں میں نفرت، حقارت، پرستش، محبت، عقیدت، لگن، ہم دردی، درد، پریشانی جیسے

متعدد متنوع لہجوں کا تخلیقی اظہار ہوا ہے۔ ان کے مصرعوں میں کہیں محبت کی سرگوشی ہے، کہیں ہوا کی نرمی و لطافت ہے تو کہیں کہیں ایک باغی کی بلند آہنگی بھی ہے۔ یہ نرمی و لطافت اور بلند آہنگی جذبے اور احساس کی صداقت کی وجہ سے بھی معلوم ہوتی ہے اور اس تصنع سے پاک ہے جو عام طور پر بلند آہنگی کے ساتھ ظہور کرتا ہے۔

تیرے گلاب رنگ
معصوم چہرے پر
عشق کی چمک دیکھ کر
ہم تو مر گئے (ہم تو مر گئے)

اس شہر کی گلیوں میں
بھاگتے ہوئے کونا کونا ڈھونڈ رہے ہیں
کسی بے چارے غریب کا نیم مردہ جسم
تا کہ مرنے سے پہلے اس کو پکڑ لیں
ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھا لیں
اس ذلیل مخلوق کو (مالک کے کتے)

میں نے پوچھا شبنم سے
تیری عمر ہے کتنی
کہا اس نے مسکرا کر
کم سے کم تیرے جتنی (سوال)

سر رکھ کر رونے کے لیے
ایک کندھا چاہیے
بہت اداس ہوں میں
آج کی رات (مجھے کندھا چاہیے)

خلیل طوق اُرقدرت سے ایک عاشق کا دل لے کر آئے ہیں۔ یہ عشق پیشگی ان کے لیے نظریۂ حیات بن کر ابھرا ہے اور ان کے دل کو انسانیت کے احترام سے سرشار کر رہا ہے۔ اس حوالے سے وہ کلاسیکی مزاج رکھنے والے شاعر ہیں جو ایک طرف محبوبِ مجازی کی زلفِ گرہ گیر کی اسیری کے خواہش مند ہیں تو دوسری طرف محبوبِ حقیقی سے تعلقِ خاطر انھیں مضطرب رکھتا ہے اور تیسری طرف دکھی انسانیت کا درد ان کا دل چیرتا رہتا ہے۔ یہ سہ جہاتی محبت اس عشق پیشگی کا عطیہ ہے جو ان کے تخلیق کار دل و دماغ سے پیدا ہوئی ہے۔

خلیل طوق اُر کے مصرعوں کی ساخت دیگر اردو شاعروں کے مصرعوں کی ساخت سے یکسر مختلف ہے۔ اس طرح ان کے لفظوں کا انتخاب بھی عام اردو شاعروں سے مختلف ہے۔ یوں انھوں نے زبان کے بنے بنائے سانچوں میں تبدیلی کر کے بھی اردو کو ثروت مند کیا ہے اور نئے اسالیب کا در وا کیا ہے۔ ان کے مصرعوں کو پڑھتے ہوئے اردو شاعری کے قاری کے ذہن میں متبادل الفاظ اور مصرعے چکراتے رہتے ہیں، کیوں کہ وہ ان کے الفاظ اور ان کی ترتیب سے آشنا نہیں ہے۔ لیکن یہی الفاظ اور ان کی نشست و برخاست خلیل طوق اُر کی شاعری کا امتیاز ہے۔ مثلاً ان کی ایک نظم کا عنوان ہے ''نوعِ بشر کی رات۔'' بنے بنائے ضابطوں کا خوگر ذہن ''نوع انسان'' بل کہ ''بنی نوعِ انسان'' لکھنے پڑھنے کا عادی ہے۔ اس نظم کی پہلی لائن ہے: ''اندھیری رات کی گہرائی ہے۔'' روایتی ذہن ''گھپ اندھیری رات ہے'' کی توقع کرتا ہے۔ اس طرح ''شب و روز کے غوغا سے اب تنگ آ چکا ہوں'' میں ہمارا شاعر ''غوغا'' کے بجائے ''شور'' لکھنا پسند کرتا ہے۔ اسی طرح نبیِ پاک کے لیے انھوں نے ''سرتاج'' کا لفظ لکھا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ لفظ ''شوہر'' کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس لیے روایت کا خوگر ایسا لکھنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

خلیل طوق اُر کی متعدد نظمیں ایسی ہیں جن کو بلا خوفِ تردید اردو کی اعلا درجے کی نظموں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ ''اے سمندر کے قطرو،'' ''آج پھر نیا سال آیا،'' ''بہت یاد کرے گی تو،'' ''دل تنگ ہے،'' ''افریقا کی آواز،'' ''آخری فریاد،'' ''کٹھ پتلی،'' ''نوعِ بشر کی رات،'' ''آخری نیند سونے سے پہلے،'' ''سوال،'' ''مجھے کندھا چاہیے،'' ''دشتِ تنہائی،'' ''آگے چلیں گے،'' ''مالک کے کتے،'' ''نوحہ،'' ''خواہشات،'' ''جب آنکھ کھل گئی،'' ''ہم تو مر گئے،'' ''ڈرتا ہوں،'' ''ایک ایسا الٹا نگر چاہیے،'' ''چوکیداری کر رہا ہوں،'' ''دنیا کی کہانی،'' ''ایک آخری آنسو،'' ''سوراخ'' اور ''گہری نیند ہے'' ایسی نظمیں ہیں جو گہرے تخلیقی شعور کی آئینہ دار ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی دیگر نظمیں کم تر درجے کی ہیں بل کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان نظموں کی تخلیقی فضا ایک بالکل نئے شاعر کا پتا دیتی ہے اور ایک ایسے تجربے کا

اظہار ہے جو اردو میں نیا ہے۔

خلیل طوق اُر کے اس مجموعے میں پابند شاعری بھی شامل ہے۔ گمانِ غالب ہے کہ انھوں نے اردو کی غزلیہ روایت پر چلنے کی سعی کی ہے لیکن شعوری یا غیر شعوری طور پر اردو غزل میں ایک نئے تجربے کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اردو میں غیر مردف غزل، آزاد غزل، نثری غزل، وغیرہ کے تجربے تو ہوئے ہیں لیکن غیر مقفّا غزل کا تجربہ ہنوز نہیں ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس صنف شاعری کی ہیئت میں قافیے کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن خلیل طوق اُر نے یہ کام کر دکھایا ہے۔ انھوں نے غزلوں کی بنیاد قافیے کے بجائے ردیف پر رکھی ہے اور یوں اس ہیئتِ شعر میں نئی صورت اختراع کی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو قافیے کے بغیر ردیف شاعر کے تخیل کی آوارہ خرامی میں ایک آزادی فراہم کرتی ہے اور اسے اپنے موضوعات کے، زیادہ ترمیم کے بغیر، بہترین بیان کا موقع فراہم کرتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس مجموعے کی اشاعت کے بعد اردو شعرا اس تجربے کی طرف راغب ہوں اور اس نئی سہولت سے فائدہ اٹھانے پر مائل ہو سکیں۔

خلیل طوق اُر کی شاعری کا خمیر اس دردمندی سے اٹھا ہے جو اعلا تخلیقی عمل کا لازمی جزو ہے اور جس کے بغیر ہر شعر تصنع اور ہر ادب ادھورا ہے۔ اس دردمندی کو انھوں نے اپنے باطن کی گہرائیوں سے اخذ کیا ہے اور شعری ہیئت عطا کی ہے۔ خلیل طوق اُرتر کی کی ایک یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے چیئر مین اور پروفیسر ہیں۔ ان کی یہ شاعری ان کی تدریسی ضرورت نہیں ہے، بل کہ ان کے شفاف باطن کا تخلیقی اظہار یہ ہے اور اردو شاعری میں اضافے کا درجہ رکھتی ہے۔ امید ہے کہ اردو دان طبقہ ان کی اس کاوش کو قدر کی نگاہ سے دیکھے گا اور اس شعری مجموعے کو اردو شاعری کے سنجیدہ قارئین کی پذیرائی حاصل ہو سکے گی۔ ❑

[به شکریه، ''ماہنامہ اخبارِ اردو'' (اسلام آباد)، مارچ ۲۰۰۸، صفحه ۷۲ تا ۷۴]